تھا اور مُفتی کو ان کے نعرے اور للکارے ناگوار گزر رہے تھے۔

جب ہم کچی چڑھائی کا ایک موڑ مُڑے تو سامنے گھاس کا ایک وسیع میدان نظر آیا۔ اس کے عین وسط میں ریوڑ کے چار اُونچے درخت ایستادہ تھے۔ مُفتی نے رُک کر کہا "چائے کا مقام مل گیا۔"

"کہاں؟ کہاں؟" سب نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہ سامنے" مُفتی نے سوٹی سے اشارہ کیا۔

"اور پانی؟" لیڈر نے پوچھا۔

"پانی کی تلاش میں لیڈر جائے۔" عماد بولا اور پھر ہم نے "لیڈر، لیڈر" کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ لیڈر ہماری کم ہمتی کے آگے ہتھیار ڈال گیا اور ہمیں درختوں کے جُھنڈ کی طرف لے چلا۔ بڑی خوبصورت گھاس تھی۔ کہیں کہیں اِکا دُکا پھول کھِلے تھے۔ اعظمی اِن پھولوں کے نام بتا رہا تھا۔ مسعود انہیں سوٹیاں مارتا چل رہا تھا۔ پائین کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ جب ہم اپنی اپنی کمریں کھول کر آرام سے بیٹھ گئے، تو لیڈر نے اپنی کِٹ سے کیتلی نکالی اور کہنے لگا "اب مُردوں کی طرح بیٹھ کیوں گئے ہو؟ پتھر اکٹھے کر کے چُولہا بناؤ اور کھنگلے جلاؤ۔"

مَیں نے کہا "دس منٹ تک ہم سے بات نہ کرنا ورنہ ہم ماریں گے۔"

"ماریں گے اور رکھ کر عذرِ سُستی ماریں گے۔" اعظمی نے کہا۔

لیڈر بڑبڑا کر خاموش ہو گیا، لیکن اپنی جگہ سے اُٹھا نہیں۔ دراصل وہ بھی تھک گیا تھا اور تھکا ہُوا آدمی جب ایک مرتبہ بیٹھ جائے تو پھر اُس سے اُٹھا نہیں جاتا۔ ہم سب آنکھیں موند کر گھاس پر لیٹ گئے اور ہماری خاموشی نے ہماری توجہ کا دامن وسیع کر دیا۔ کوئی ایک منٹ کے سکُوت کے بعد ہمیں ڈرب ڈرب اور ٹکل ٹکل کی آواز آنے لگی۔ لیڈر اپنی جگہ سے تڑپ کر اُٹھا اور گردن گھما کر بولا "ادئے کیلنو چشمہ تو یہ چل رہا ہے، ہماری کمروں کے پیچھے۔" عماد نے کہنی کے بَل ہو کر دیکھا ذرا سی اُونچائی پر گھاس کے سرسبز پودوں کے درمیان پانی کے بڑے بڑے قطرے کوزہ بھر گہرائی میں گر رہے تھے۔ عماد نے لیڈر سے کہا "بیٹا کیتلی لے جا کر اِس ٹرکل کے نیچے رکھ دے۔"

یہ کہہ کر وہ پھر لیٹ گیا اور اپنے رُومال سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ سُورج کی تیز اور تیکھی کرنیں درختوں کی ڈالیوں سے ہو کر اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔

کوئی پندرہ منٹ اسی طرح لیٹے رہنے کے بعد مسعُود "الاّ اللہ" کا نعرہ مار کر اُٹھا اور پتھر ڈھونڈنے لگا۔ اعظمی بھی اُس کے پیچھے چلا پھر مَیں اور عماد اُٹھ کر کھنگلے اکٹھے کرنے لگے۔ ریوڑ کے درختوں کی چھانگ اور غیر قانونی طور پر کاٹی ہوئی لکڑی کے بڑے چھوڑے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ ہم نے چُولہا بنایا، آگ جلائی اور کیتلی اُس پر دھر دی۔ پھر توشہ دان سے پراٹھے اور انڈوں کی ٹکیاں نکالیں اور چُولہے کے سامنے بیٹھ کر کھانے لگے۔ بڑی شدید بُھوک لگی تھی اور اُونچائی پر لطیف اور زُود ہضم خوراک میں لطیف سی چٹنی کا کام دے رہی تھی۔

جب ہم کھانا کھا چکے اور کیتلی میں مکس چائے بن چُکی تو لیڈر نے ہر ایک کی پیالی لبالب بھرتے ہوئے کہا "اوے مُردو! کوئی بات کرو۔ اب تو کھانا بھی کھا لیا ہے۔"

"ضرور ضرور" مسعُود نے اپنی آخری بُرتی گرم چائے کے گھُونٹ سے آگے دھکیلتے ہوئے کہا "شاہ جی سے اس کے بابے کی باتیں سُنتے ہیں۔"

"بابا بوبا کوئی نہیں یار" عمر نے کہا "اِس سے اِٹلی کی لڑکیوں کی باتیں سُنتے ہیں۔"

"دفع کر یار اِٹلی کو۔ گولی مار" عماد نے کہا "سو مرتبہ دیکھا ہے ہم نے اِٹلی۔ یہ بتاؤ شاہ جی کہ آپ نے چین میں کیا دیکھا اور ان کو ہم سے کیسے مختلف پایا۔"

"واہ وا" مُفتی نے کہا "چین، چین، چین۔"

مَیں نے کہا "یار چین مَیں نے دیکھا ضرور ہے، لیکن بڑی دیر ہوئی دیکھا تھا۔ اب پتہ نہیں اس کا حال کیا ہو گا۔"

"کوئی بھی حال ہو" مسعود نے کہا "تم موجودہ حال کو بھُول جاؤ، اپنے زمانے کی بات کرو۔"

"چین صُوفیوں کا مُلک ہے اور وہاں تصوّف کا فلسفہ چلتا ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ" عمر نے چڑ کر کہا "کوئی عقل کی بات کرو۔ اتنے بڑے عظیم انسان کو صُوفی بنا رہے ہو، راہب بنا رہے ہو، گوشہ نشین بنا رہے ہو۔"

مَیں نے کہا۔ "عمر جب تک مَیں نے صُوفی ازم کے بارے میں کچھ نہ پڑھا تھا اور تصوف کے بارے میں علم حاصل نہ کیا تھا میری بھی یہی سوچ تھی، جو تمہاری ہے اور ایک مَیں کیا ہر شریف آدمی اور پڑھے لکھے مہذب آدمی کی یہی سوچ ہے، لیکن اس علم پر ایک دو کتابیں پڑھنے کے بعد اور ان سے کچھ حاصل نہ کر سکنے کے بعد مَیں اِن بابوں اور بزرگوں کی تلاش میں نکلا، جو ہمارے علم، ہماری دھرتی، ہماری سائیکی اور ہماری مٹی سے تعلق رکھتے ہیں، جن کے پاس ہمارے لنگروں کا علم اور ان کی وراثت ہے۔"

"یہ جو پیر فقیر ہوتے ہیں۔" عمر نے سر جھٹک کر کہا۔ "روپے دوگنے کرنے والے؟"

"یہ بھی اور ان کے علاوہ دوسرے بھی جو بڑی بڑی پگڑیاں باندھتے ہیں۔ ڈاڑھی کو مہندی لگاتے ہیں۔ ہاتھ میں چھڑی رکھتے ہیں۔ ڈکار لیتے ہوئے ایکسکیوزمی کے بجائے الحمدللہ کہتے ہیں اور پُرانی قسم کے حنائی کاغذ پر چھپی ہوئی کتابیں پڑھتے ہیں۔ استنجا کرتے ہیں، مصافحہ کرنے کے بعد دونوں ہاتھ سینے پر لگاتے ہیں۔"

"تمہیں کیا ضرورت آ پڑی تھی ان لوگوں سے ملنے کی؟" مسعود نے پُوچھا۔

"اس لیے۔" مَیں نے کہا۔ "کہ مَیں ٹائم، لائف، نیوز ویک، سوویٹ نیوز اور ریڈرز ڈائجسٹ پڑھ پڑھ کر تنگ آ چکا تھا اور میرا دل چاہنے لگا تھا کہ مَیں ان بابوں کی بات بھی سُنوں جنہیں میں اور میرا باپ اور میرے بھائی بہنیں کئی سال ہوئے گاؤں میں چھوڑ آئے تھے۔ دراصل مَیں اپنے لنگروں سے ملنا چاہتا تھا۔ مَیں ہر ہفتے "حلقے" میں جا جا کر اُداس ہو گیا تھا۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" مُفتی نے پُوچھا۔

"یہ مُفتی جی ۶۴ء اور ۶۵ء کی درمیانی مدت کا ذکر ہے۔ مَیں نے اپنا پورٹیبل ٹیپ ریکارڈ لیا اور لائل پور، سالار والی، گولڑہ شریف اور پاکپتن شریف کے چکر لگانے لگا کہ شاید یہاں مجھے کوئی ایسا بابا مل جائے جس کے پاس ہمارے لنگروں کا اصل علم ہو۔ وہ علم نہ ہو جو مودودی صاحب اور پرویز صاحب اور ڈاکٹر اسرار صاحب اور ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ اور جامعہ اشرفیہ اور اقبال اکیڈیمیوں کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ چنانچہ اِس سفر وسیلہ ظفر کے دوران مجھے چند اصل بابوں سے ملنے کا اتفاق ہُوا، جو اکتسابی علم نہ رکھتے تھے۔ پنجابی کے سوا اور کوئی

زبان نہ جانتے تھے۔ تبحرِ علمی سے ناآشنا تھے۔ شخصیت کے اعتبار سے بڑے سادہ اور لہجے اور اظہار کے بڑے نرم تھے۔ میں نے ان سے کچھ باتیں سُنیں۔ کچھ باتیں ان میں دیکھیں۔ کچھ مجھے سمجھ آیا، باقی کا سارا میرے پلے نہیں پڑا۔

"لاہور میں جب میں نے ایک بابا سے کہا کہ میں صوفی ہونا چاہتا ہوں، تو انہوں نے پوچھا کس لیے؟ میں نے کہا کہ "اس لیے کہ یہ مجھے پسند ہے۔" آپ نے کہا "مشکل کام ہے سوچ لو" میں نے عرض کیا "اب مشکل نہیں رہا کیونکہ اس کی پرائمری اور مڈل پاس کر چکا ہوں۔ پاس انفاس نفی اثبات کا وِرد کر لیتا ہوں۔ اسمِ ذات کے محل کی بھی پریکٹس ہے۔ آگے کے راستے معلوم نہیں، وہ آپ سے پوچھنے آیا ہوں اور آپ کی گائیڈنس چاہتا ہوں۔"

بابا نے ہنس کر کہا تو پھر تم روحانی طاقت حاصل کرنا چاہتے ہو، صوفی بننا نہیں چاہتے ہو۔ میں نے کہا اِن دونوں میں کیا فرق ہے؟ کہنے لگا روحانی طاقت حاصل کرنے کا مقصد صرف خرقِ عادات یعنی کرامات کا حصول ہے اور یہ طاقت چند مشقوں اور ریاضتوں سے پیدا ہو سکتی ہے، لیکن تصوّف کا مقصد کچھ اور ہے؟ وہ کیا؟ میں نے پوچھا تو بابا نے کہا تصوّف کا مقصد خدمتِ خلق اور مخلوقِ خدا کی بہتری میں لگے رہنا ہے۔ مخلوق اللہ سے دُور رہنا رہبانیت ہے اور اللہ کی مخلوق میں اللہ کے لیے رہنا یہ پاکی ہے اور دین ہے۔ مجھے اس بابا کی یہ بات اچھی نہ لگی، بے چارہ پینڈو بابا تھا اور اس کا علم محدود تھا۔ میں اُٹھ کر آنے لگا تو کہنے لگا روٹی کھا کر جانا۔ میں نے کہا، جی کوئی بات نہیں، میں ساہیوال پہنچ کر کھا لوں گا۔ کہنے لگا، خدمت سعادت ہے، ہمیں اِس سے محروم نہ کرو۔ میں طوعاً و کرہاً بیٹھ گیا۔ بابا اندر سے رکابی اور پیالی لے آیا۔ پھر اُس نے دیگچے سے شوربا نکال کر پیالی میں ڈالا اور دال رکابی میں چنگیر سے مجھے ایک روٹی نکال کر دی جسے میں ہاتھ میں پکڑ کر کھانے لگا۔ وہاں مکھیاں کافی تھیں۔ بار بار ڈائیو لگا کر حملے کرتی تھیں۔ بابا میرے سامنے بیٹھ کر مکھیاں اڑانے کے لیے کندوری ہلانے لگا اور میں روٹی کھاتا رہا۔

اتنے میں مغرب کی اذان ہوئی۔ کونے میں اس کے مریدوں اور چیلوں نے تھوڑی سی جگہ لیپ پوت کر کے ایک مسجد سی بنا رکھی تھی۔ وہاں دس بارہ آدمیوں کی جماعت کھڑی ہو گئی۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑی ندامت ہوئی کہ میں روٹی کھا رہا ہوں اور پیر مکھیاں جھل رہا ہے۔ میں نے کہا بابا جی آپ نماز پڑھیں۔ کہنے لگے آپ کھائیں۔ میں نے کہا، جی مجھے بڑی شرمندگی ہو رہی ہے آپ جا کر نماز پڑھیں۔ مسکرا کر بولے، کوئی بات نہیں آپ کھانا کھائیں تھوڑی دیر بعد میں نے پھر کہا۔ جناب عالی، انہوں نے نیت بھی باندھ لی ہے آپ نماز ادا کریں قضا ہو جائے گی۔ بابا ہنس کر بولا نماز کی قضا ہے بیٹا، خدمت کی کوئی قضا نہیں۔ آپ آرام سے روٹی کھائیں۔۔۔

"میں اس جیسے تین بابوں سے تین مختلف جگہوں میں ملا اور ہر جگہ سے مجھے مایوسی ہوئی نہ کسی نے کوئی ورد بتلایا نہ وظیفہ سکھایا نہ اسم اعظم کی ترکیب بتائی۔ بس یہی حکم دیا کہ خلق خدا کی خدمت کرو۔ ان کے درمیان رہو۔ تصوف کی منزلیں خود بخود طے ہوتی چلی جائیں گی۔ میں نے اس علم کو بے کار اور بوگس جان کر پھر ٹائم، نیوز ویک اور سوویٹ نیوز کا مطالعہ شروع کر دیا۔ کوئی ایک سال بعد مجھے چین جانے کا اتفاق ہوا اور ایک ہفتے کے قیام کے بعد مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ چین کے سب لوگ صوفی ہیں اور ماؤزے تنگ ایک بڑا پیر ہے۔ گو ان کا رخ دنیا کا ہے اور وہ رفعت انسانی کے لیے کوشش کر رہے ہیں لیکن ان کا طریق کار اور انداز حصول اور مدارج طے کرنے کا قرینہ سارے کا سارا صوفیا جیسا ہے۔ صوفیا کہتے ہیں ملنے کے لیے جاننا ضروری نہیں۔ جو فرمان کو سن لیتا ہے وہ گناہ سے پاک ہو جاتا ہے کیونکہ جو سن لیتا ہے اس پر کرنے کا مقام آجاتا ہے۔ پہلے سننا ہے، اس کے بعد کرنا اور اس کے بعد جاننا ہے۔ سارا چین اس تصور کی لپیٹ میں لپٹا ہوا ہے۔ پہلے ساری مخلوق ماؤ کے فرمان کو سنتی ہے پھر اس پر بلا حیل و حجت عمل شروع کر دیتی ہے اور جب عمل اپنے آخری مراحل میں داخل ہو جاتا ہے تو لوگوں پر خود بخود کھلنے لگتا ہے کہ فرمان کی روح اور اس کا فلسفہ کیا تھا۔ ان میں گیان اور علم اور جان کاری پیدا ہو جاتی ہے۔ میں نے چو پاڈچی سے پوچھا۔ یار تمہارے ملک کے لوگ ماؤ کی بات اس طرح سے کیوں مانتے ہیں اور اس پر بلا حیل و حجت کیوں عمل کرتے ہیں اور یہاں ڈسکشن اور سفٹنگ اور تھرشنگ کا کیوں رواج نہیں ہے تو اس نے ہنس کر کہا سفٹنگ تھرشنگ منافقوں اور ریاکاروں کے فلسفے ہیں۔ جب مان ہی لیا، تو پھر وقت ضائع کرنے

سے فائدہ؟ جب باپ کو مان لیا تو والدہ کے پاس جاکر تمام تفصیلات کی تحقیق کرنے سے فائدہ؟ مجھے یاد آیا کہ لاہور کے ایک بابے نے مجھ سے کہا تھا۔ بات اُس وقت تک نہیں مانی جاتی جب تک بات والے کو نہ مانا جائے ...

چین کا اور چین کے لوگوں کا سب سے بڑا فلسفہ آمنّا وصَدقنا ہے جو بات بڑا پیر کہے گا وہی حق ہوگی۔ اس کے بعد جو خلیفہ کہے گا، وہی درست ہوگی، اسی پر عمل ہوگا۔ توڑ پھوڑ کیپٹیلسٹوں کی اور کمیونسٹوں کی عطا ہے۔ چین میں نہ لوگوں کے اندر توڑ پھوڑ کا عمل جاری ہے نہ باہر۔ نہ وہاں تنقیدی مجلسیں آراستہ ہوتی ہیں نہ گفتگو بازوں کی پالیاں جمتی ہیں، نہ حلقے ہیں نہ گِلڈ۔ لوگ ہیں اور آپس کا میل جول ہے اور خوشیاں اور سنگتیں ہیں اور گانا بجانا، پچھانا اور ہنسنا ہے۔ مَیں نے جو پاؤچی سے بڑا کہا کہ اور نہیں تو کم ازکم پیکنگ میں ایک اعلیٰ درجے کے حلقۂ اربابِ ذوق قسم کی مجلس ہی بنالو جہاں لوگ آسکیں، ایک دوسرے سے آزادانہ طور پر معاملات ڈسکس کر سکیں، ایک دوسرے کو اپنے علم کی چھچی سے ناک پکڑ کر دوا پلاسکیں، لیکن اس کمبخت نے میری بات نہ مانی اور مجھے شک ہُوا کہ وہ پاک چین دوستی کمزور کرنے کے لیے سب درشن میں لگا ہُوا ہے۔ اُس نے کہا، ہمارے فلسفے کی یہ بنیاد ہے کہ جو جس چیز کا علم نہیں رکھتا وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہتا۔ جب تک وہ عملی طور پر عرفان حاصل نہ کرلے۔ اپنے ہڈ گوڈے اس میں نہ جلائے۔ جب تک پُوری کیفیت اُس پر نہ وارے وہ بات کرنے کا مجاز نہیں، مَیں نے کہا، یہ تو ہمارے صُوفی بھی کہتے ہیں کہ صاحبو، جس درجے کی توفیق نہ ہو اس کا اعلان یا اقرار نہیں کرنا چاہیے۔ اُس نے کہا۔ مَیں صوفی کو تو نہیں جانتا، لیکن ہمارے یہاں یہی بات ہے کہ اگر مَیں نے کھیت میں کام نہیں کیا تو کھیت کی بات نہیں کروں گا۔ اگر فیکٹری میں کام نہیں کیا تو فیکٹری کی بات نہیں کروں گا اور اگر سکول میں نہیں پڑھاتا تو درس و تدریس کی بات نہیں کرونگا۔

مَیں نے کہا گویا تمہارے یہاں صاحبِ حال ہی اپنے حال کی بات کرسکتا ہے۔ اُس نے پُوچھا صاحبِ حال کا کیا مطلب ہے؟ مَیں نے کہا۔ صاحبِ حال وہ ہوتا ہے جو ایک تو حال پر گُذر رہا ہو، نہ ماضی کی یاد میں مبتلا ہو، نہ مستقبل سے خوفزدہ ہو۔ دوسرے یہ کہ اس پر ایک خاص علم کا، ایک خاص عمل کا اور ایک خاص کیفیت کا تاثر ہو۔ ہمارے یہاں صُوفیا رایسی بات کہنے،

ایسا اعلان کرنے اور ایسی تحریر لکھنے سے منع کرتے ہیں جو متکلم کی اپنی کیفیت نہ ہو، اپنا حال نہ ہو. مثلاً ایک خاص کیفیت، ایک خاص جذب، ایک خاص واردات کی بدولت جو کہا جائے یا لکھا جائے اُسے تو حق سمجھتے ہیں باقی کو ناحق۔ اپنا حال ہے تو نظم، غزل، نعت لکھنے کو جائز سمجھتے ہیں۔ طرح مصرع پر غزل لکھنے کو ریا اور مُنافقت پر محمول کرتے ہیں۔ اسی طرح اپنا حال ہے اور خلقِ خدا میں رہ کر زندگی بسر کی ہے اور ان کی زندگی اور ان کی کیفیات اور ان کی مشکلات اور ان کے انبساط کو حال بنایا ہے، تو مضمون لکھ سکتے ہیں ورنہ ریا کاری ہے اور خلقِ خدا کے ساتھ منافقت ہے'۔ چو باؤچی نے ڈائری نکال کر چینی زبان میں 'حال' اور 'صاحبِ حال' کی ترکیبیں لکھ لیں اور ہنس کر مجھ سے پُوچھنے لگا۔ تم صاحبِ حال ادیب ہو؟ مَیں نے کہا میرے چار افسانے صاحبِ حال کی کیفیت کے ہیں باقی کے تین سو اٹھارہ مضمون مُنافقت اور ریا کے ہیں'۔ اُس نے ہنس کر کہا، 'بڑی خطرناک پروپورشن ہے'۔ مَیں نے کہا 'ایسے ہی ہے اور یُونہی ہو گا'۔ پھر اُس نے پُوچھا یہ باتیں جو تم نے ابھی بتائیں کِسی کتاب میں ہیں جو مَیں واپس کراچی جاکر خرید سکوں؟ مَیں نے کہا 'ایسی تو کتاب نہیں'۔ 'تو پھر تم نے کہاں سے سُنیں؟' ۔ اُس نے پُوچھا۔ مَیں نے کہا 'ان بابوں سے جو ہمارا پُرانا علم رکھتے ہیں'۔ اُس نے خوش ہو کر کہا 'تو گویا تمہارے یہاں بھی یہ سسٹم ہے۔ فیڈ بیک کا! تم لوگوں سے ملتے ہو اور ان سے سیکھتے ہو'۔ مَیں نے کہا 'ایسا تو کوئی سسٹم نہیں۔ مَیں تو اپنے شوق کی غرض سے گیا تھا صُوفی ازم کا علم سیکھنے اور انہوں نے میرے ہاتھ میں ایک گُھنگُو تھما دیا کہ خلقِ خدا کی خدمت کرو۔ فیض یاب لوگوں کی صحبت میں رہو، سارے درجے آپ سے آپ مل جائیں گے۔ ہمارے پاس آنے کی ضرورت نہیں...

واہ' چو باؤچی نے سَر ہلا کر کہا 'خوب لوگ ہیں تمہارے مُلک کے ہ اصل، سچے، سٹرنگ گولڈ'

مَیں نے کہا 'مَیں نے اُن سے ملنا ترک کر دیا ہے۔ بے چارے اور ان پڑھ سے لوگ ہیں۔ لباس میں بھی مجھ سے مختلف۔ تعلیم میں بھی مجھ سے مختلف اور سوچ میں بھی مختلف۔ ان کی تو بولی بھی میری بولی سے مختلف ہے۔ کہتے ہیں اگر خُدا کو راضی کرنا ہے تو اُس کے محبوب کو خوش کرو اور خدا کا محبوب وہ انسان سمجھتے ہیں جسے اُس نے بنایا۔ پھر اپنی رُوح اس میں پھُونکی پھر اس کے لیے عزازیل کو ابلیس بنا کر ذلیل و خوار کیا۔ وہ کہتے ہیں اُونچا مقام حاصل کرنا ہے، تو خدا کے محبوب کی

خدمت کرو۔ اس کو خوش کرو۔ اس کی خوشامد کرو وہ آپ سے آپ ہاتھ میں آجائے گا۔ عین اسی طرح جس طرح عاشق کے رُوبرُو محبوب کی تعریف کرنے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے سے عاشق خوش ہوتا ہے، چوپاؤچی نے کھڑکی سے باہر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ کرو خوش اس کو کرو خدمت اس کی، بڑا آسان کام ہے۔ تم کرتے کیوں نہیں ہو؟ تم کو تو تمہارا خدا بھی انہی کی بدولت مِل رہا ہے؟

مَیں نے چوپاؤچی کو خوش کرنے کی غرض سے کہا: ہمیں خدا نہیں چاہیئے یار۔ ہم پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ لوگ ہیں، ہم خدا کو لے کر کیا کریں گے اور چونکہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں اس لیے ہم نے اس کے محبوب کو لے کر چاٹنا ہے؟ ہمیں تو اس کے جھٹلانے کے لیے اور اس کا بطلان کرنے کے لیے قدم قدم پر اُس کے محبوب کے ناسیں دُھوآں دینا پڑتا ہے، اسے ٹکٹکی پر کھینچنا پڑتا ہے۔ چاہے سرکاری دفتر ہو، چاہے سبزی منڈی ہو، چاہے بازار ہو، چاہے حویلی ہو، چاہے ادبی محفل ہو، چاہے نمازِ عید ہو ہمیں کسی نہ کسی صورت اُس کے محبوب کو چانٹے مار کر سیدھا رکھنا پڑتا ہے۔ اگر ایسا نہ کریں تو کمبخت سر چڑھ جائے۔ میری بات سُن کر چوپاؤچی زور سے ہنسا۔"

عمر نے نعرہ مار کر کہا "ختم کر اپنی رام کہانی۔ بکواس کہیں کا۔ نہ تصوّف سے واقف نہ مارکسزم سے۔ یادیاں مارے جاتا ہے دیسی بابوؤں کی طرح۔ اوئے سائنس اور ٹیکنولوجی کی دنیا میں دیسی اور بینڈو علموں کا کیا فائدہ؟"

"شاباش" اعظمی نے کہا "دیسی علم سے تو دیسی کنک ہی پیدا ہوگی۔ نَس بندی کا علم تو نہیں آسکے گا۔"

"تُو بھی نہ بک"۔ لیڈر نے جھڑک کر کہا "ہر بات میں حُجّت ہی سُوجھتی ہے۔ سیدھی طرح سے بول بھی نہیں سکتا۔"

ہم نے اپنی اپنی کٹیں اُٹھائیں۔ ان میں طے شدہ اُصول کے مطابق پیالیاں، چائے کا ڈبہ، چینی اور خشک دُودھ کے ڈبے، کیتلی اور پین، ڈالے اور پھر آگے کی طرف چلنے لگے۔ اب مُفتی کی طبیعت کچھ بوجھل ہو گئی تھی اور اس کے قدم مشکل سے اُٹھتے تھے، وہ بار بار رُکتا اور ہم سب سے آگے چلنے کو کہتا، لیکن کوئی بھی اس کو پیچھے چھوڑ کر چلنے کے لیے تیار نہ تھا۔ مسعُود

کا خیال تھا کہ اُسے ایک چٹان کی اوٹ تلے بیٹھنا اور آرام کرنا چاہیئے اور سفر ترک کر دینا چاہیئے۔ لیڈر بضد تھا کہ اگر ہم میں سے ایک بھی پیچھے رہ گیا تو مہم کا لُطف آدھا ہو جائے گا۔ میری، عماد کی اور اعظمی کی کوئی رائے نہ تھی۔ ہم اچھے عوام کی طرح بڑے لیڈروں کے آخری فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ اتنے میں بادل زور سے گرجا اور ہم سب نے نگاہیں اُوپر اُٹھا دیں۔ صرف مُنّی اپنی چھڑی پر جُھکا ہُوا نیچے راستے کو دیکھتا رہا۔ لیڈر نے کہا "بارش کے آثار ہیں مُنّی کا ساتھ چلنا ٹھیک نہیں۔ اس کو بڑی تکلیف ہو گی" لیڈر کے بدلے ہوئے نظریئے پر مُنّی کو دُکھ پہنچا لیکن وہ مُنہ سے کچھ نہ بولا۔ کوئی سو گز کے فاصلے پر ایک بڑی سی چٹان پہاڑ کے پہلو سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ لیڈر ڈبل لگا کر اسے دیکھنے لگا اور اس کا معائنہ کرنے کے بعد زور سے بولا "لے آؤ اس کو۔ بڑی فٹ کلاس جگہ ہے۔ لیٹ بھی سکتا ہے، بیٹھ بھی سکتا ہے" ہم مُنّی کو بازوؤں سے پکڑ کر اس طرف لے چلے۔ اس کو ہمارا سہارا دینا اچھا نہ لگا اور اُس کے چہرے پر تکدّر کے آثار پیدا ہو گئے۔

دراصل مرد کا مرد کو اور عورت کا عورت کو سہارا دینا بڑا ناگوار گزرتا ہے۔ جن لوگوں نے زندگی میں آپ کو سہارا دیا ہو یا آپ پر احسان کیا ہو، وہی آپ کو سب سے زیادہ بُرے لگتے ہیں اور آپ ان کی جان کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ سہارا لینے کے لیے آپ کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آپ کمزور ہیں اور آپ کو کسی کی مدد کی ضرورت ہے۔ سہارا دینے والا جب پہلی مرتبہ آگے بڑھ کر آپ کا ہاتھ تھامتا ہے، تو آپ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک قوی ہیکل، مضبوط، تنومند پہلوان خم ٹھونک کر اکھاڑے میں اُترا ہے اور اُس نے آپ کے ساتھ پنجہ ملایا ہے۔ جب وہ آپ کو سہارا دیکر پہلا قدم اُٹھاتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اُس نے آپ کو اڑنگے پر چڑھایا اور دوسرے قدم پر پٹخنی دے دی۔ اُس سے پٹنے اور شکست کھانے کے بعد آپ کے پاس زندہ رہنے کے لیے ایک ہی آرزو رہ جاتی ہے کہ کب وہ دن آئے جب مَیں اس کو چڈھی پر چڑھا کر اس طرح پٹخنی دوں اور اپنی ہزیمت کا بدلہ اُتار دوں۔ سالہا سال گزرنے کے بعد جب سہارا دینے والا آپ کے ہاتھوں پٹتا ہے تو حیران رہ جاتا ہے کہ میرے ساتھ یہ سلوک ET TN BRATE لیکن یہی سہارا جب انسان کو مخالف جنس سے ملتا ہے، تو اس کی ساری عمر سہارا دینے والے ہاتھ کو چُومتے اور اس کی کلائی سے گال رگڑتے گذرتی ہے اور اسے ہر گھڑی

یہی خوف لگا رہتا ہے کہ یہ ہاتھ مجھے چھوڑ نہ دے، مجھ سے دُور نہ ہو جائے۔

اس معاملے میں عورت کو مرد پر فوقیت حاصل ہے۔ وہ بچے کو سہارا دیتی ہے جوان کا تکیہ بنتی ہے اور بوڑھے کو اُنگلی سے پکڑ کر گور تک پہنچنے میں مدد دیتی ہے۔ جوانی میں عورت کا یہ کمال اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ اُس کی نگہ انتخاب جب اپنے محبوب پر پڑتی ہے تو اس کا سب سے پہلا سنجیدہ سوال یہ ہوتا ہے کہ "آپ اس طرح سے کیوں رہتے ہیں؟" اور "اس طرح" کی تفصیلات بہم کرنے میں مرد کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے اور اُسے زندگی میں پہلی مرتبہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اُس کے دُکھ درد میں شریک ہونے کے لیے "مے آئی کم اِن پلیز" کہہ کر دروازے پر ہلکی سی دستک دے رہا ہے۔ مرد کا جواب عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ "مجھے آج تک کسی نے سمجھا نہیں اور میری ضروریات کی طرف توجہ نہیں دی"۔ ان ضروریات میں خوراک، لباس، سیکس، محبت، تفریح اور دھول دھپا بھی کچھ شامل ہوتا ہے۔ لڑکی کبھی اُس سے یہ نہیں کہتی کہ آج سے میں آپ کو سمجھنے کی کوشش کروں گی یا میں آپ کی ضرورتیں پوری کروں گی یا میں آپ کو سہارا دُوں گی۔ وہ تو بس چُپ چاپ ٹکٹکی باندھ کر اپنے محبوب کو تکے جاتی ہے اور اس کی آنکھوں کے اندر ایک نازک سا ہاتھ آگے بڑھتا ہے اور محبوب کا سارا وجود اس کے ساتھ جھولنے لگتا ہے اور جب ان کی شادی ہو جاتی ہے تو پہلی ہی رات کو نوجوان اپنی زندگی کے سارے واقعات، سارے دُکھ، ساری کلفتیں کھول کر رکھ دیتا ہے اور اپنے عزیزوں، رشتہ داروں، دوستوں اور مہربانوں کے سلوک اس کے قدموں کے سامنے اس طرح بکھیر دیتا ہے کہ دُلہن کے نازک پاؤں کو ٹھوکر لگانے میں آسانی رہے اور بگڑی ایسے ہونٹوں کو نفرین بھیجنے میں دِقت نہ ہو۔ پھر شادی کے دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ مرد اپنی ساری کلفتیں، سارے دُکھ، سارے بوجھ ایک ایک کر کے گھر لاتا رہتا ہے اور بیوی سے مزید سہارے کی التجا کرتا رہتا ہے۔

مُنّی چونکہ مرد تھا اور اُسے سہارا دینے والے ہم سب اُس کے دوست بھی مرد تھے، اس لیے اُس کے چہرے پر تکدّر کے آثار پیدا ہو گئے اور اُس نے ان ہاتھوں کو پسند نہ کیا جنہوں نے اس کے بازُو تھام رکھے تھے۔

جب ہم اُس کھوہ کے پاس پہنچے جہاں مُنّی کو بٹھانا تھا اور ہمیں آگے جانا تھا اور پھر لوٹتے ہوئے اس کو وہاں سے لینا تھا تو میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ ایک سادھو تھا بڑی عمر کا جس نے گیروے کپڑے پہن رکھے تھے اور سر اور بھنویں منڈائی ہوئی تھیں اور اس کے پاس پیتل کا ایک تاملوٹ تھا اور وہ برگد کے تنے کے سہارے بیٹھا تھا۔ اتنے بڑے برگد کے نیچے جتنے بڑے برگد تلے مہاتما بدھ کو نروان ہوا تھا۔ یہ برگد ہمارے قصبے کے سکول سے کوئی فرلانگ بھر کے فاصلے پر تھا اور اس کے نیچے اتنا اندھیرا تھا کہ ہم لڑکے کبھی اُس کی چھاؤں میں سے نہ گزرے تھے۔ مجھے جب بھی کسی آسیب زدہ جگہ کا خیال آتا ہے اُس برگد کا اندھیرا، اُس کے پتوں کی گرد اور اُس کی داڑھیوں کے گچھے ضرور یاد آجاتے ہیں۔ مَیں اُس وقت چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا اور نیکر پہن کر سکول جاتا تھا۔ جس دن پہلے پہل مَیں نے اُس سادھو کو اس برگد تلے دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے وہ سُرخ کھنکتی ہوئی مٹی کا ایک بُت ہو جس کی آنکھوں میں گہرے سبز رنگ کے کنچے پڑے ہوں۔ مَیں نے اُسے حرکت کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ جس مقام پر پہلے دن دیکھا تھا، دو تین مہینے تک اسی طرح اسی حالت میں دیکھتا رہا۔

پھر ایک دن وہ سادھو لیٹ گیا اور اُس کا تاملوٹ بھی اُس کے قریب ہی لیٹ گیا۔ انہی دِنوں ہمارے قصبے میں سُرخ آندھی آئی اور سارے گھر سُرخ مٹی سے اَٹ گئے۔ سادھو کے جسم پر برگد کے پتوں کا ایک ڈھیر جمع ہو گیا۔ پھر ایک دن بارش برسی۔ زور کی موسلا دھار بارش اور وہ سادھو کے جسم سے سارے پتے بہا کر لے گئی۔ دو پتے اُس کے لیٹے ہوئے تاملوٹ میں اُسی طرح پڑے رہے۔ مَیں سکول سے آتے جاتے نظریں چُرا کر اس سادھو کو ضرور دیکھا کرتا۔ میری رفتار برگد کے پہلو میں قدرے سُست ہو جاتی اور مَیں خوف کے مارے تیزی سے چل نہ سکتا۔ پتہ نہیں وہ خود بھول کر اِدھر آ گیا تھا یا اُس کے گھر والے اُسے بھول گئے تھے یا شاید کسی سے بھی بھول نہ ہوئی ہو اور نروان کی طلب اُسے یہاں لے آئی ہو۔ دراصل بھول اور طلب میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ طلب جب صادق ہو جاتی ہے تو بھول بن جاتی ہے۔ طالب کو اپنا پرایا، دوست دشمن، گرد و پیش، خود اپنا وجود، کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ بس ایک طلب کی بھنبھیری سی گھومتی رہتی ہے، باقی سب کچھ لاہو ہو جاتا ہے۔ محبوب بھی جب اپنے چاہنے والے کو بھول جاتا

ہے، تو طلب کی ایک بھنبھیری سی بن جاتا ہے۔ جاہ کی طلب، زر کی طلب، نمود کی طلب، آسائش کی طلب اُس کے چاہنے والے کی تلاش بن کر اسے کُو بہ کُو لیے پھرتی ہے۔ ایسا ہی وہ سادھو تھا۔ نہ وہ کسی کو بھولا تھا نہ کسی نے اُسے بھلایا تھا۔ بس برگد کے نیچے ذرا سستانے اور دم لینے کو ٹھہر گیا تھا اور اُس کا یہ "دم"۔۔۔ بہت ہی لمبا ہو گیا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے اُس بُت کے چہرے پر ڈاڑھی بڑھی، بھنویں نکلیں، ابرن گل کر بدن پر چیتھڑے بن گیا۔ ستر ننگا ہو گیا اور میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ موئے زہار کو دیکھا۔ گرمیوں کی چھٹیوں سے کوئی دس دن پہلے میں نے سکول جاتے ہوئے اُس بُت میں حرکت کے آثار دیکھے۔ اُس کے گھٹنے اُوپر کو اُٹھتے تھے اور پھر نیچے بیٹھ جاتے تھے۔ سر ہلکے ہلکے دائیں بائیں ہلتا تھا اور ایک ہاتھ میں بھی جنبش تھی۔ جب میں دوپہر کے بعد سکول سے لوٹا تو سادھو کے جسم کی حرکت بند ہو چکی تھی اور دو پیلے دھاری دھار بھونڈ اُس کی آنکھوں پر بیٹھے تھے۔ رات بھر اُس کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے گھومتا رہا۔ اگلے دن سکول جاتے ہوئے میں نے حوصلہ کر کے برگد کے نیچے نگاہ ڈالی تو سادھو ابھی تک وہاں لیٹا ہوا تھا اور اُس کے چہرے اور اُس کی ننگی رانوں کے ساتھ بے شمار بھونڈ اور بھڑیں چمٹی ہوئی تھیں۔ شام کے وقت کمیٹی کے چوڑھے اُسے گندگاڑی میں ڈال کر لے گئے۔

جب مُفتی اپنی چھڑی زمین پر رکھ کر اس کھوہ میں بیٹھنے لگا، تو میں نے چیخ مار کر کہا۔ "یہ نہیں ہو سکتا۔ مُفتی یا تو ہمارے ساتھ چلے گا یا ہم سارے نہیں جائیں گے۔"

"لیکن کیوں؟" لیڈر نے تنک کر پوچھا۔

"اس لیے کہ اسے ہمارے ساتھ ہی رہنا ہوگا۔ ہم اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔" میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں یار۔" مُفتی نے مصالحت آمیز لہجے میں کہا۔ "تم لوگ جھیل دیکھ آؤ۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

"نہیں مُفتی جی نہیں۔" مسعود نے سر ہلا کر کہا۔ "جھیل آپ سے زیادہ امپارٹنٹ نہیں۔ پھر کبھی سہی۔"

ہم سب نے مسعود کی ہاں میں ہاں ملائی اور مُغنی اپنی سوئی اُٹھا کر پھر ہمارے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔

راستہ لمبا تھا۔ جھیل ابھی دُور تھی اور اُونچائی تیزی سے اُوپر کو اُٹھتی جا رہی تھی۔ ہم چند قدم چلے ہوں گے کہ مُغنی کو سانس لینے کے لیے پھر رُکنا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی سارا قافلہ رُک گیا۔

جب قافلوں کا زمانہ تھا اور لوگ سفر اختیار کرنے کے لیے ہفتوں، مہینوں بلکہ سالوں تک ہم سفروں اور کاروانوں کا انتظار کیا کرتے تھے کہ کب آئیں یا کب روانہ ہوں تو شریکِ سفر ہوں۔ یہ قافلے اور کارواں دورانِ سفر ایک فرد کے لیے ٹھہر جایا کرتے تھے اور اس وقت تک ٹھہرے رہتے تھے جب تک اس فرد کی ضرورت پُوری نہ ہو جاتی تھی۔ یہ اجتماعی دَور تھا اور آدمی ایک دوسرے کی لڑی میں پروئے ہوئے نیچر کے ساتھ بندھے تھے، لیکن جب انفرادیت کا دَور آیا تو افراد ایک دوسرے سے الگ ہو کر منفرد ہو گئے۔ منفرد سوچ، منفرد مزاج، منفرد شوق، منفرد پسند، اس انفرادیت نے انسان کو بڑے خوشنما اور رنگین تحفے عطا کیے۔ اس کے وجود میں ہنس اور سُرخاب کے پَر نکل آئے، لیکن وہ اکیلا ہو گیا۔ خوفناک اور زور آور دنیا کا سامنا کرنے کے لیے بے یار و مددگار، یکہ و تنہا۔

ایک امریکی عورت سَر پر پیلا رومال باندھے ٹٹو پر سوار جھیل دیکھ کر واپس آ رہی تھی۔ اُس کے ساتھ ساتھ سیاہ ڈاڑھی والا ایک لمبا گائیڈ چل رہا تھا اور ان کے پیچھے بھوری ڈاڑھی اور سُنہرے بالوں والا ایک لمبا تڑنگا کوہستانی مرد جا رہا تھا۔ لیڈر نے اُسے روک کر کہا۔

"خان ہمارے ساتھی کو اُٹھا کر جھیل تک چلو گے۔ ہم تمہیں دس روپے دیں گے۔" دس رُپے کا نام سُن کر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور اپنی چپلی کے بند کسنے لگا۔ پھر اُٹھ کر بولا: "کون دوست ہے تمہارا؟"

"یہ" مسعود نے سوئی سے مُغنی کی طرف اشارہ کیا اور مُغنی نفی میں سَر ہلا کر بولا "نہیں یار میں اس کی پیٹھ پر نہیں چڑھوں گا۔ میں چلوں گا۔"

"کیوں نہیں چڑھو گے؟" اعظمی نے حیرانی سے پُوچھا۔

"یہ انسان کی بے حُرمتی ہے۔" مُغنی بولا اور آگے چلنے لگا۔

"اوئے ٹھہر"۔ لیڈر کڑکا۔ "آیا کہیں سے بڑا ترقی پسند۔ روز تمہارا کیا خیال ہے ہم آدمیوں کی پیٹھوں پر نہیں چڑھتے؟"

"چڑھتے ہیں" مُنّی نے رُک کر کہا۔ "لیکن اس طرح سے نہیں۔ چالاکی سے چڑھتے ہیں۔ محبت سے چڑھتے ہیں۔ ہشیاری سے چڑھتے ہیں۔"

"تو اب بھی ہشیاری کے زور پر چڑھ جا" مسعود ہنس کر بولا اور پھر ہم سب ہنسنے لگے۔ کوہستانی کو ہماری ہنسی بڑی بے معنی سی دکھائی دی اور وہ باری باری ہم سب کا منہ تکنے لگا۔

"کوئی بات نہیں مُنّی جی" عماد نے سنجیدگی سے کہا۔ "چڑھ جاؤ کوئی نہیں دیکھے گا۔ کوئی نہیں بتائے گا۔"

مُنّی کچھ ڈانواں ڈول سا ہو گیا تو لیڈر نے اپنی سوٹی اُوپر اُٹھا کر کہا۔ "لو بھئی قسم کھاؤ خدا کی جس نے کوہستانی اور اس کی پیٹھ پیدا کی ہے کہ کوئی بھی واپس جا کر یہ نہیں بتلائے گا کہ مُنّی نے راستے میں ایک آدمی پر سواری کی تھی۔"

ہم سب نے یک زبان ہو کر قسم کھائی اور اس عہد کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے دائیں ہاتھ اُوپر ہوا میں اُٹھا دیئے۔ کوہستانی زمین پر بیٹھ گیا اور مُنّی اُس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ ہم پھر اسی طرح سے چلنے لگے۔ کچھ اُونٹ کی چال کچھ اصیل مُرغے کی چال اور کچھ دھڑ ٹوٹے ہوئے کُتّے کی طرح۔ ہمارا اور مُنّی کی ڈنڈا ڈولی کا فاصلہ کوئی دس قدم کا تھا۔ اچانک اُس نے آواز لگا کر کہا۔ "ہٹ جاؤ۔ ایک طرف ہو جاؤ، بھگت کبیر کی بیوی آ رہی ہے۔" مُنّی کی آواز سُن کر ہم رُک گئے اور کوہستانی اُسے لے کر ہمارے قریب آ گیا۔ مُنّی نے کوہستانی کے گلے میں بازو ڈالے ڈالے کہنا شروع کیا کہ ایک روز بھگت کبیر مہاراج کے گھر چند سادھو مہمان آئے۔ اتفاق سے اُس وقت اُن کے گھر پر کھانے پینے کی کوئی چیز موجود نہ تھی اور مہمانوں کو بھوکا رکھنا کبیر جی کا دھرم نہ تھا۔ بہت پریشان ہوئے اور اپنی بیوی سے کہنے لگے۔ اب کیا علاج کیا جائے؟ بیوی نے کہا، مہاراج کہنے کی بات تو نہیں لیکن اب مشکل ایسی آ پڑی ہے کہ کسے بنا رہا بھی نہیں جاتا۔ ایک بنیا مجھ پر عاشق ہے اور مجھے دیکھ کر ٹھنڈی سانسیں بھرا کرتا ہے۔ اگر کہو تو اُس سے کچھ سودا لے آؤں۔ کبیر جی نے کہا نیکی اور پُوچھ پُوچھ۔ جاؤ شکار کرو۔ کبیر کی بیوی

جو نہایت خوبصورت اور بلا کی حسین تھی، بنیے کی دکان پر گئی اور کہا بے وقت مہمان آگئے ہیں۔ گھر پر کوئی چیز موجود نہیں۔ ان کے لیے اتنا سامان مطلوب ہے۔ بنیے نے کہا اس شرط پر دیتا ہوں کہ تو رات کو میرے پاس رہے اور میری بغل گرم کرے۔ کبیر جی کی بیوی نے حامی بھر لی اور بنیے کی شرط مان کے سودا لے آئی اور مہمانوں کو پکا کر کھلا دیا۔ جب رات زیادہ ہو گئی تو بھگت کبیر نے کہا لو اب کپڑے بدلو۔ زیور پہنو اور جو وعدہ بنیے سے کیا ہے اُسے پورا کرو۔ بیوی نے بارہ ابرن اور سولہ سنگھار کیے اور کبیر جی اُسے اپنی پیٹھ پر لاد کر بنیے کے گھر کی طرف لے چلے۔ بڑی محبت سے لے جا کر اُسے بنیے کے دروازے پر جا اُتارا اور خود پلٹ آئے۔ بنیا اپنی محبوبہ کو دیکھ کر خوشی سے پھولا نہ سمایا اور اُس کی نگاہیں سر سے پاؤں تک نثار ہونے لگیں۔ چونکہ بارش ہو رہی تھی اور ساری گلیاں کیچڑ سے بھری تھیں اس لیے اپنے محبوبہ کے پاؤں دیکھتے ہی حیران ہو کر بولا تمہاری جوتیاں کیوں صاف ہیں؟ ذرا کیچڑ نہیں لگی۔" کبیر مجھے اپنی پیٹھ پر لاد کر یہاں لایا ہے"۔ یہ بات سنتے ہی بنیے کی حالت بدل گئی۔ قصور معاف کرایا اور کہا، تو میری ماں ہے۔ آٹے دال کا بھاؤ سب بھول گیا اور رام نام کا جاپ کرتا ہردوار کی طرف نکل گیا۔

اعظمی نے سنجیدگی سے کہا" ویسے مُفتی شکل وصورت سے اس وقت تو بھی ہماری ماں ہی لگتا ہے، بتا ہم کدھر کو نکل جائیں"؟

ہم ہنسے تو کوہستانی نے کہا" آگے چلو صاحب تمہارا یہ دوست کافی وزنی اے"۔

جب ہم چلنے لگے تو میں نے زور کی ایک ہانک لگائی کہ ؎

کبیرا ایسے ہو رہو جیسے نرمل نیر
پیچھے پیچھے ہر پھرے کہت کبیر کبیر

مسعود تڑپ گیا اور رُک کر بولا" شاہ جی اسے پھر پڑھو اور اس وقت تک پڑھتے رہو جب تک تمہاری سانس نہ ٹوٹ جائے"۔ میں نے بڑی مشکل سے پہلا مصرعہ پڑھا اور میری سانس ٹوٹ گئی۔ جب میں کالج میں پڑھتا تھا تو یہ دوہہ ہمیں صوفی تبسم نے سنایا تھا۔ اُس وقت بانو قدسیہ بھی ہمارے ساتھ پڑھتی تھی، لیکن جس دن صوفی صاحب نے یہ دوہہ سنایا تھا

اُس روز دہ چھٹی پر تھی مجھے یہ دو پہر وہ دن، قدسیہ کی چھتی اور صوفی صاحب کا اُس دن کا لباس آج بھی اچھی طرح سے یاد ہیں اور میں ان ساری چیزوں کو ملا کر ایک تصویر بنا سکتا ہوں۔ عورتوں کو واقعات اور حادثات من حیث المجموع یاد رہتے ہیں اور مردوں کو ان کی تفصیلات یاد رہتی ہیں عورت خالق ہے اور مرد کرافٹس مین ہے۔ عورت اپنے اندر ہی سے پُرانا سُرانا خام مواد لے کر ایک جیتا جاگتا برینڈ نیو بچہ تخلیق کر دیتی ہے اور مرد بھاگ بھاگ کر اور چار دانگ عالم سے چھوٹی چھوٹی چیزیں اکٹھی کر کے بڑی چابکدستی کے ساتھ ایک مووی کیمرہ، ایک وی۔ ٹی۔ آر۔ ریکارڈر یا ایک فوٹوسٹیٹ مشین بنا سکتا ہے۔ مرد پرفیکشنسٹ ہوتا ہے اس لیے اس کی نظر ہمیشہ جُزئیات پر رہتی ہے۔ زندگی اور محبت کے میدان میں وہ چھوٹے چھوٹے پیچ اور ڈھبریاں کستا چلتا ہے اور اس کا ایک تریچ ڈھیلا ہو جانے سے ساری مشین لڑکھڑانے لگتی ہے۔ عورت کے تانے بانے کا مواد ایک ہی ہوتا ہے کہیں سے ایک تار بھی ٹوٹ جائے تو بھی کپڑے کی مجموعی نوعیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

ہم سارے دوست آہستہ آہستہ مُفتی کی ڈنڈا ڈولی کے آگے چلے جا رہے تھے اور ہم میں سے ایک ایسا بھی تھا جس نے سولہ سال ایک لڑکی کے ساتھ بے پناہ محبت کی تھی اور اپنی اور اپنے گھر والوں کی ساری زندگی اس محبت کی دہلیز پر قربان کر دی تھی۔ ابتداً میں جب ان دونوں کی نگاہیں آپس میں ملیں، تو لڑکی گرم شال کی بُکل مار کر سویٹر بُننے لگی اور ہمارا دوست شام کے وقت چوبارے کی کھڑکی میں کھڑا ہو کر اُس چاند کا نظارہ کرنے لگا جو شہر پر چمکتا تھا اور جس پر اس لڑکی کی نگاہیں بھی مرکوز ہو سکتی تھیں۔ اپنے گھر کے غسل خانے میں وہ پانی کے نل کو تھام کر گھنٹوں کھڑا رہتا کہ شاید شہر کے دوسرے کونے پر منہ ہاتھ دھونے کے لیے اُس نے بھی نل کھولا ہو اور زمین کے اندر ہی اندر جبتی پائپوں کے رستے اُس کے ہاتھ کا لمس یہاں تک پہنچ گیا ہو۔ اُس کی نوٹ بک میں شہر کے ان تانگوں کے نمبر تھے جن میں اُس نے اس مقصد سے سواری کی تھی کہ شاید ان میں کبھی فرزانہ بیٹھی ہو گی۔ اُس نے اپنے شہر کے ہر کھمبے کو ہاتھ لگا کر دیکھا تھا کہ شاید راہ چلتے ہوئے کبھی فرزانہ کا ہاتھ یا بُرقعے کا کونہ اس سے ٹکرایا ہو۔

ہم سب فرزانہ کو جانتے تھے اور اپنے اپنے طور پر اُس کی طبیعت سے واقف تھے۔

اُس نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہ کی تھی جس سے یہ ظاہر ہو سکے کہ وہ ہمارے دوست کو چاہتی ہے یا اُس پر اسی طرح سے مرتی ہے جیسے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر وہ مر رہا تھا۔ فرزانہ تو اپنے جسم کے خام مواد سے ریشم کے کیڑے کی طرح ایک تار سا نکال رہی تھی اور اس میں لپٹتی جا رہی تھی۔ اس کو خدا کے چاند یا کیمٹی کے نلکے یا بجلی کے کھمبے کا کوئی سہارا نہیں تھا۔ اس کے اس طرح پلٹے جانے کی کیفیت نے ہمارے دوست کو عجیب طرح کے واہموں میں گرفتار کر دیا تھا۔ خود ہم بھی کسی حتمی نتیجے پر نہ پہنچ سکے تھے کہ فرزانہ کو اس سے محبت ہے یا نہیں۔ پھر ان دونوں کے درمیان خط و کتابت شروع ہو گئی۔ دونوں طرف سے محبت کے اقرار ہونے لگے۔ وعدے وعید ہونے لگے۔ ہجر اور بیقراری کی داستانیں بیان ہونے لگیں اور دونوں کے درمیان کسک کی جگہ تڑپ نے لے لی، لیکن دونوں کی بنیادی خصوصیت میں کوئی فرق نہ آیا۔ ہمارا دوست جب اُس کے نام خط پوسٹ کرنے جاتا تو اُس بس کا ٹکٹ سنبھال کر رکھ لیتا جس میں سوار ہو کر وہ جی پی او گیا تھا۔ بس سے اُتر کر لیٹر بکس تک جاتے ہوئے وہ ہر مرتبہ اپنے قدم ضرور گنا کرتا۔ اور انہیں اس ٹکٹ کی پُشت پر رقم کر لیا کرتا۔ جی پی او کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ ہر بار اس کنکر کو ضرور اُٹھایا کرتا، جو سیڑھی پر قدم دھرنے سے پہلے اس کے پاؤں تلے آیا ہوتا۔ اُس کے پاس بس کے بہت سے ٹکٹ، کنکروں کی ایک پوٹلی اور قدموں کی بے شمار گنتی جمع ہو گئی تھی۔ فرزانہ کے پاس صرف اُس کے خط تھے، بدن کے گرد کشمیری شال تھی اور دل میں شاید اُس کی یاد تھی۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان کے درمیان ملاقاتیں ہونے لگیں۔ طویل اور خاموش ملاقاتیں۔ فرزانہ کے سارے گھر والے ڈرائنگ رُوم میں جمع ہوتے، ہمارا دوست بھی پہنچ جاتا۔ چائے کا دَور چلتا، سیاست پر گفتگو ہوتی، فلموں کی باتیں ہوتیں، ریڈیو پروگراموں پر تنقید کی جاتی اور رات گئے ہمارا دوست گھر واپس لوٹتا۔ ان طویل اور لاتعلق ملاقاتوں میں فرزانہ اور ہمارے دوست کے درمیان تعلق کا بس ایک ہی فقرہ اُبھرا کرتا اور وہ بھی لفظوں کے بغیر۔ جب ان دونوں کو سب کی موجودگی میں اظہارِ محبت کرنا مقصود ہوتا یا اُن کے سینے محبت کے بوجھ تلے چیخنے لگتے یا ایک کربناک چیخ اُن کے وجود کے اندر گونج بن کر گھومتی اور باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ ملتا، تو وہ اپنی پوری آنکھیں کھول کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور پھر تین مرتبہ اپنے پپوٹوں کو

بند کرتے اور پھر آنکھیں بند کر کے شانت ہو جاتے۔ یہ شانتی، یہ سکون اور یہ اطمینان ان کی شخصیتوں کے اندر بہت کچھ چھیل دیتا جیسے تابوت کا ڈھکنا فٹ کرنے کے لیے دھیمے ہاتھ کا رندہ چلتا ہے۔

مہینوں پر مہینے اور برسوں پر برس گذرتے رہے اور ان کے درمیان آنکھیں کھولنے اور بند کرنے کا سلسلہ سولہ سال پر محیط ہو گیا۔ اِس اثنا میں ہم سب نے اپنے دوست کو مختلف قسم کے مجرّب نسخے عطا کیے۔ اپنے اپنے تجربات سے نوازا اور اس کو جسمانی محبت کی طرف رشدت سے اُکسایا، لیکن اُس کا انجن ایسا جام ہُوا تھا کہ اُس طرف گیئر ہی نہ بدلتا تھا۔ اُس نے کئی مرتبہ کوشش کی، کئی سکیمیں بنائیں، ہم نے بھی مواقع فراہم کیے، لیکن وہ پیوٹوں کے بسط و کشاد سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ہمارا خیال ہے اس لڑکی کی چند برگزیدہ سہیلیوں نے بھی اس کو ایسے ہی مشورے دیئے ہوں گے جبھی تو وہ ہمارے دوست کی پیش قدمیوں کے آگے استقبالی بن گئی۔ پھر ان دونوں کی ملاقات ہو گئی۔ ملاقی شدن ہیر بارانجھا در باغ۔ اور وہ دونوں موت کے کنارے جا کھڑے ہوئے۔ ہمارا دوست موت کی پرچھائیں بن گیا اور اُس پر دنیا کی ہر نعمت کے دروازے بند ہو گئے۔ آہستہ آہستہ زندگی پر اُس کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی اور وہ ایک ڈھنڈار ویرانے میں تبدیل ہو گیا۔ ہمارا نسخہ اُلٹ ثابت ہُوا۔ دراصل وہ اس مٹی سے نہیں بنا تھا جس سے عام لوگ بنتے ہیں اچھے شریف خوش وضع، خوش اطوار لوگ۔ وہ ایسے گارے سے بنا تھا جو مسجد کے پرنالے سے بہ کر زمین پر جمع ہو جاتا ہے اور جس میں مُصلّوں کے تنکے اور صفوں کے دھاگے شامل ہوتے ہیں۔ ایسی مٹی سے بننے والے لوگ نہ نمازی ہوتے ہیں نہ دنیا دار نہ سوختنی نہ فروختنی۔ کھنگر سے ہوتے ہیں کوئی انہیں ٹھوکر بھی نہیں مارتا۔ ٹھوکریں کھانے والے لوگوں کی اَنا بڑی مضبوط ہوتی ہے۔ ان میں زندگی کے ساتھ ٹھٹھا مذاق کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

سازگار ماحول میں رہنے والوں کی اَنا بڑی رنگین ہوتی ہے ان میں ریشم کی سی لچک پیدا ہو جاتی ہے اور ان کے وجود میں بھنورے کی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہمارا دوست آئینے کی کرچیوں سے بنا تھا وہ کرچیاں جو مصالحے کی چوڑی سے چپکی ہوتی ہیں۔ دباؤ پڑنے پر اکھڑتی

بھی رہتی ہیں لیکن دُھندلانے تک ایک ہی کلائی سے وابستہ ہو کر اس کا عکس دیکھتی رہتی ہیں۔ اس ملاقی شدن سے ہمارا دوست اور گمبھیر اور غم ناک اور خاموش ہو گیا جیسے لمبی اور ٹھنڈی سانس بھرنے سے بے شمار اور چھوٹی چھوٹی آہیں سینے میں سپنولیوں کی طرح کلبلانے لگتی ہیں جیسے نکسیر میں ناک صاف کرنے سے خون اور تیزی سے بہنے لگتا ہے۔

لیڈر زور سے چیخا "اوئے اشفاق تو پھر پیچھے رہ گیا"

مَیں نے نگاہیں اُوپر اُٹھا کر دیکھا تو میرے ساتھی ایک اُونچی صدا کی حد تک مجھ سے دُور ہو گئے تھے۔ حماد چھڑی کا سہارا لے کر کُبڑا سا ہُوا ہولے ہولے ہنس رہا تھا اور اس کی ہنسی میں شرارت تھی۔ مَیں اس کے قریب پہنچا تو اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور سنجیدگی سے بولا "شاہ جی! سچ سچ بتانا اس وقت کیا سوچ رہے تھے؟"

مَیں نے کہا "مَیں علم طبقات الارض کی بابت سوچ رہا تھا"

اس نے چلنے کا اشارہ کر کے پُوچھا "پھر کس نتیجے پر پہنچے؟"

مَیں نے کہا "مَیں ذہن کی تہوں میں کچھ زیادہ نیچے نہیں پہنچا تھا کہ لیڈر نے آواز دے دی"

"ابھی اور نیچے جانے کا ارادہ تھا؟" اس نے ہنس کر پُوچھا۔

مَیں نے کہا "ابھی تھوڑا سا نیچے اور جا سکتا تھا"

"لیکن جہاں تک پہنچے" عماد نے کہا "وہاں کیا دیکھا؟"

"وہاں!" مَیں نے سر جھکا کر کہا "وہاں کیٹی کے پاپیوں کا ایک جال بچھا تھا۔ کچھ کمزور ہو گئے تھے۔ کچھ کھنگرا گئے تھے۔ چند ایک میں سے پانی سِم رہا تھا، لیکن ہر نالی کے اندر سے سسکیوں کی آواز آ رہی تھی"

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا "اس جھرنے کو دیکھو شاہ جی، کیا گیت گاتا ہُوا جا رہا ہے۔ یہ گلیشیر کا پانی ہے اس میں گیت ہوتے ہیں سسکیاں نہیں"

مَیں نے کہا "اپنے اپنے کان ہیں عماد کسی کو گیت سُنائی دیں گے کسی کو کراہیں"

اعظمی نے پلٹ کر کہا "لو سالے دونوں پیچھے رہ گئے" مُنّی کی سواری ان کے ساتھ ساتھ جا رہی تھی اور اس نے کوہستانی کے ماتھے پر اپنے ہاتھوں کی کنگھی ڈالی ہوئی تھی۔ ماتھے کا

اور ہاتھ کا بڑا پرانا رشتہ ہے۔ کچھ ہاتھ ماتھے تک سلام کرنے کی غرض سے جاتے ہیں۔ کچھ لٹکی ہوئی زلف اٹھانے کے لیے۔ کچھ ماتھا پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ کچھ ہاتھ ماتھا پیچھے دبانے اور ہونٹ اوپر اٹھانے کی غرض سے بڑھتے ہیں۔ کچھ ہاتھ دور دیکھنے کے لیے ماتھے کا سائبان بنتے ہیں اور کچھ پریشانی کے عالم میں جبیں پیمائی کرنے لگتے ہیں۔ پھر کچھ ہاتھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو مریض کے ماتھے سے لگتے ہی اس کی بیماری سلب کر لیتے ہیں وہ آنکھیں کھول کر اپنے پر جھکے ہوئے چہرے کو دیکھتا ہے اور سارے میں روشنی پھیل جاتی ہے۔ الفاظ اظہار کا بڑا سہارا ہیں لیکن ہم ان کے بغیر بھی گفتگو کرتے ہیں۔ بدن کی بولی بڑی مؤثر بولی ہے اور انسان اس کا مطلب خوب سمجھتا ہے۔ ہر حرکت، ہر جنبش، ہر لچک اپنے اندر ایک معنی رکھتی ہے۔ اس کے لیے مخاطب کو کوئی ڈکشنری دیکھنی نہیں پڑتی۔ کسی سے معنی پوچھنے نہیں پڑتے۔ جب آپ دل ہی دل میں کسی کی پذیرائی کرتے ہیں، کسی کو قبولیت کا شرف بخشتے ہیں تو باتیں کرتے ہوئے آپ کے بازو کھل کھل جاتے ہیں اور ہاتھوں کی انگلیاں پھیل پھیل جاتی ہیں۔ آپ کرسی سے آگے جھک کر بات کرتے ہیں۔ میز پر کہنیاں ٹیک کر سر آگے کر کے بولنے لگتے ہیں۔ کوٹ کے گریبان کے یا بلاؤز کے بٹن کھولنے سے آپ کی مراد یہ ہوتی ہے کہ آؤ تمہیں اپنے دل میں بٹھالوں۔ تم سے دل کی باتیں کروں۔

جب کوئی خوبصورت چودہ سالہ لڑکی سڑک پر سے گزرتی ہے تو نوجوان دکاندار دونوں بازو پھیلا کر انہیں کمر کی طرف لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ بزرگ اپنی ڈاڑھی کھجانے لگتے ہیں۔ خوش پوش مرد کا ہاتھ اپنی ٹائی کی طرف بڑھتا ہے۔ اطالوی لوگ اپنی دائیں گال پر دائیں ہی ہاتھ کی انگشتِ شہادت سے برمہ چلانے لگتے ہیں۔ سسلی کے لوگ بائیں کان کی بن گوش کو دائیں ہاتھ کی چٹکی سے جھٹکے دینے لگتے ہیں۔ جب آدمی پریشان ہوتا ہے تو ساکت ہو جاتا ہے اور دونوں ہاتھوں سے کرسی کے آرمز پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ کبھی کبھی اس کے کندھے بیچارگی کے عالم میں ذرا ذرا ہلتے ہیں اور پھر رک جاتے ہیں۔ جو عورت اپنے دونوں بازوؤں کو سینے پر کنڈلا کر آپ سے باتیں کرتی ہے وہ حفاظتِ خود اختیاری کا اعلان کر رہی ہوتی ہے اور بازوؤں کی فصیل کے پیچھے سے آپ سے ہمکلام ہوتی ہے۔ جو بار بار اپنے سینے کو دوپٹے سے ڈھانپتی